

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے درمیان محبت و خلوص اور ارادت کا ایک تعلق خاص تھا۔ اس حوالے سے کئی تذکروں میں مواد ملتا ہے۔ ذیل میں جناب آغا شورش کاشمیری مرحوم کی تین کتابوں "مولانا ابوالکلام آزاد"، "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اور "بونے گل نالہ دل" کے مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے مواد کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آغا صاحب مرحوم نے اپنی یادداشتوں میں اس موضوع پر قلم اٹھا کر بہت سے واقعات کو محفوظ کر دیا ہے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے، ان شاء اللہ آئندہ کسی فرصت میں مختلف تذکروں، آپ بیتیوں اور سوانحی کتابوں سے مولانا اور شاہ جی کے حوالے سے موجود مواد کو یکجا کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔ (مدیر)

شاہ جی ہندوستانی مسلمانوں کے ویرانہ آباد میں قدرت کا عطیہ تھے وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ، ایک ادارہ، ایک تحریک اور جماعت تھے، ان سے بڑا عوامی خطیب نہ اردو زبان نے پیدا کیا اور نہ مستقبل قریب میں اس کے آثار ہی نظر آتے ہیں، ان کے کلام و بیان کی تاثیر و سحر کا یہ حال تھا کہ دلوں کی سنگینی موم کی طرح پگھلتی اور دماغوں کا انجماد رواں ہو جاتا۔ انہیں ہوا کے جھونکے اور سمندر کی موجیں بھی گونج بڑا آواز ہو کر سنتی تھیں، ان کا بیان تھا کہ وہ مسجد ہی کے حجرے میں اپنی زندگی گزار دینا چاہتے تھے اور اس بیج ہی سے ان کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی لیکن "الملال و زیندار" انہیں جدوجہد کے میدان میں لائے اور "ستارہ صبح" نے ان کے بگڑے میں آگ لگا دی۔ الملال کے بارے میں فرمایا۔

"الملال نے ان کی شریانوں میں لہو دوڑایا اور وہ محرک انسان کی طرح قرن اول کی طرف لوٹ گئے پھر وہاں سے بال و پر لے کر ہندوستان کے افق پر پرواز کی۔ الملال نے قرآن فہمی کے ذوق میں انہیں وسعت و تنوع دیا اور ان کی کایا کلب ہو گئی۔ ان کی خطابت کا اسلوب اور اس کے مختلف زاوے الملال کے مرہون ہیں۔ آزاد..... ان کے ذہنی مرشد تھے۔ ان سے بہت سی افلاقتوں میں فیضان حاصل کیا، ہر ملاقات علم و نظر کی ایک نئی دریافت ہوتی۔ آزاد جس موضوع پر بولتے، معلوم ہوتا انہیں کا خانہ زاد ہے، انہیں قرآن کی تفسیر میں منفرد پایا، ترجمے میں یکساں، حدیث میں یگانہ، فقہ میں بے مثال، ادب میں بحر ناپید انکار، شاعری کا معدن اور نثر میں مہم و اسفندیار۔

گھنٹوں بولتے لیکن تکرار عتقا، فنون لطیفہ میں ان کا جوڑ نہ تھا۔ امام الہند فی موسیقی پر زبان کھولتا تو گلشنِ فی گفتار سے لالہ زار کھل جاتا۔ ”خبرِ خاطر“ کا آخری خط ان کے اسی ذوقِ عظیم کی نشان دہی کرتا ہے۔ ہندوستان کے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے مختلف تصویروں پر ان کے تشریحی حاشیہ لاجواب ہیں، میں نے ایک تقریب میں مصوری سے متعلق ان کی ایک تقریر سنی ہے، ملکِ بحر کے نامور مصور جمع تھے اور وہ ان کی معلومات پر سر دھن رہے تھے۔ سنگ تراشی کے بارے میں ایک دن تاج محل کا ذکر کیا تو دنیا بھر میں گھماتے پھرے، سنگ تراشی و معماری کے ارتقاء، تہذیب کی تاریخ اس طرح بیان کی کہ مخصوص اصطلاحوں کے ساتھ خوبصورت الفاظ کی لہریں اچھل اچھل کر رہی تھیں۔ ایک دن مختلف قوموں کے فوکھات و مشروبات کی طعم بھر با بیان کی تو گفتگو کئی گھنٹوں تک پھیل گئی۔ ہم حیران تھے کہ جاپان اور میکسیکو کے فوکھات و مشروبات کی جزیات تک سے بھی آشنا ہیں۔ ایک دفعہ کبوتروں کا ذکر پھر گیا تو ان کی نسلوں اور خوبیوں کا مرقع سننا ڈالا، پھر جرنل پرند کی حادثوں پر روشنی ڈالی تو ایک تہائی دن اس کی نذر ہو گیا، کسی نے غالب کا ذکر چھیڑا تو سبحان اللہ گویا خود غالب ہیں، یا ان کے ساتھ عمر گزاری ہے، وہ ولی دکنی سے لے کر عصر حاضر کے ہر شاعر کو چلتے اور ان کے بعض چیدہ چیدہ اشعار بھی حفظ تھے، ادب کے ہر شعبہ میں ان کی نگاہ تھی۔ ایک دن رسمِ نال گا ماں پہلوان ملنے آگئے ہم لوگ وہیں تھے، اب جو پہلوانی کی تاریخ بیان کی تو ہم دمگ رہ گئے گویا رسم و اسفندیار کے ساتھ ڈنڈے پلٹے رہے ہیں۔ ہنٹ پر گفتگو کی تو پوری کتاب کبھ ڈالی۔ مولانا محمد علی الہ آباد میں سنگم پر کبھی رانی کے لئے چلے گئے واپس آئے تو ان سے یہی موضوع چھیڑ دیا، وہ گرتا کہ فن کی پوری تاریخ سامنے آگئی۔ تمباکو پر روشنی ڈالی تو نگاہیں سے کھمال نکل گئے۔ پان کا تذکرہ کیا تو پتے سے لے کر کتھے تک فور پھاری سے لے کر قوام تک، جانے کیا کچھ بیان کیا۔ ہم شدر تھے، الہ العالمین ابوالکلام ہیں کہ صیفہ کائنات۔

ایک دن مختلف ملکوں کی خواتین پر اس شائستگی سے اظہارِ خیال کیا کہ عباسی عہد کے ان داستان گو عبقریوں کی یاد تازہ ہو گئی جو اس موضوع میں عربی زبان کے بالکل کی رعایت سے یگانہ عصر تھے۔ مولانا کے طرزِ کلام کا عظیم پہلو یہ تھا کہ ان کی زبان پر کبھی مبتذل الفاظ نہ آتے، وہ ان الفاظ ہی سے نا آشنا تھے۔ فرماتے رگیب الفاظ مغرب الاطلاق قوموں کا سند اس ہوتے ہیں۔“

راقم وزارتِ مشن کے زمانے میں شاہ جی کے ہمراہ دہلی میں تھا ایک دن وقت لے کر مولانا کے ہاں پہنچے تو اس جلے کا ذکر آگیا، جو گئی رات دہلی میں جامع مسجد کے سامنے ہوا تھا اور کوئی ڈیڑھ لاکھ آدمی شریک تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس جلے میں آئے تھے۔ اور کرپس نے بھی تھوڑی سی دیر جلے کے بے پناہ ہجوم پر نگاہ کی تھی۔

شاہ صاحب، سنا ہے آپ تقریر میں گالی بھی لڑھا دیتے ہیں۔
شاہ جی نے لاحول پڑھا اور کہا:

مولانا: کوئی ذکر کر رہا تھا۔

شاہ جی : کون ؟

مولانا: میرے بھائی نام تو یاد نہیں رہا لیکن کوئی بیان کر رہا تھا۔ کان میں بھنگ پڑی تو تعجب ہوا۔

ہر کسی کا نام نہ تو حفظ کی چیز ہے اور نہ ہر نام کا پوچھنا ضروری ہوتا ہے۔

شاہ جی: تو حضرت آپ نے اس روایت پر اعتماد کر لیا۔

مولانا: سوال روایت کا نہیں نہ اعتماد کا ہے، آپ سے جو تعلق خاطر ہے اسکے باعث معاوہ چیز یاد آگئی۔

شاہ جی: ”جی نہیں۔ راوی نے غلط بیانی کی ہے بلکہ جھوٹ بولا ہے۔“

مولانا: ”وہ پھانس اس لئے داغ میں رہ گئی مگر تحریک خلافت کا زمانہ یاد آگیا۔ آج سے کوئی چوبیس یا پچیس

برس پہلے آپ نے لاہور میں ہیر وارث شاہ کے بعض بند سنائے تھے۔ ان میں کچھ ایسے ہی کلمات تھے جن میں

جل، جل، جل، ٹل قسم کے کافی تھے۔ میں نے خیال کیا جس شخص کو اس قسم کے اشعار یاد رہے ہوں ممکن ہے

حالات کی برہمی نے اس سے گالی اگلا دی ہو۔ اور شاید زبان لکھڑا سی ہو

شاہ جی: مولانا! جس شخص نے اہلال پڑھا ہو وہ گالی دے سکتا ہے؟

شاہ جی مسکرائے اور کہا۔

حضرت ربع صدی پہلے کی وہ صحبت آپ کو اب تک یاد ہے۔

فرمایا:

"میرے بھائی، سوال کسی صحبت کی یادداشت کا نہیں، گویا ہر طرح کی شاہراہوں اور

پکنڈنڈیوں سے لڑتا ہے لیکن بعض چیزیں حاطے لے خانوں میں بھول چوک ہو کر رہ جاتی ہیں،

واریت شاہ کا غلام سنا آپ کی وجہ سے جھٹھے میں ایک تار رہ گیا اب جو آپ سائے آگے لووہ تار

بھی تازہ ہو لیا۔
کچھ دیر کے

شاہ جی سبھل کر رہیں پڑے، ہم لوٹ لوٹ ہوئے۔ مولانا کی زبان سے پہلی ہی الفاظ اس طرح نکل رہے تھے لویا

قام پر سکریٹری کے رخصت رہیں۔ (۱)

شاہ جی کے صوم و ستواہ کی پابندی سے سقن لاہور کے ایک احبار کا تذکرہ کیا کہ اس کا پورا تجلیہ صوم و ستواہ کا

باقی ہے۔۔۔ میں اس کے چمکے دھولوں اپنا کپڑا لپیٹ کر اپنے ایک سہیلی سے مل رہی تھی کہ تم نے یہ کیا کیا؟

مولانا سراسے اور حرما یا:

"شاہ صاحب، جب تک انہیں میری سیاست سے اختلاف ہے اس وقت تک میرا اسلام ان کے ہاں مشکوک ہے۔ اور اگر میں ان کی سیاست کا ہواؤں تو پھر اسلام سے میرا ہواؤں بھی عین اسلام ہو گا۔ انہیں اسلام کی آڑ میں اپنی سیاست سے دلچسپی ہے۔" (۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ایک دفعہ مولانا کی نازک مزاجی پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب فقرہ بکھا تھا کہ "آپ کے تلوے میں انسانی سر کا بال آجائے تو پاؤں میں موج آجائے گی۔ پھر ہفتوں لیٹے رہیں گے کہ سید ہیں۔ انہیں سب سے زیادہ عزیز تخلیق تھا اور سب سے زیادہ پریشان بھڑ سے ہوتے۔ وہ عادتاً طلاق فی طبیعت کے آدمی نہ تھے۔ ان کا موقف تھا۔

فرغتے و کتا بے و گوشہ چمنے۔ (۳)

وزارتی مشن کے زمانے میں شاہ جی دہلی میں تھے۔ ہم کوئی دو ماہ دہلی میں اکٹھے رہے تھے اور وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار حصہ تھا۔ میں نے شاہ جی سے عرض کیا کہ میری بعض یادداشتیں ادھوری ہیں اگر اپنے خاندانی حالات پر روشنی ڈالیں تو یہ یادداشتیں مکمل ہو سکتی ہیں لیکن وہ طرح دے گئے۔

"بھائی میرے حالات لکھ کر کیا کرو گے۔"

"مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرہ میں ابوطالب کلیم کی زبانی اپنی ہی نہیں، ہماری بھی سرگزشت لکھ دی ہے۔

بدنامی حیات دو روزے نہ بود و بیش
آں ہم کلیم یا تو چلوئم چاں گزشت
یک روز صرف بستی دل شد بایں و آں
روزے دگر بکند دل زین و آں گزشت"

تفصیل طلب کیجئے تو مسکرا دیں گے، آغا فہیدیم اور بس..... لیکن مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کا روپ قطعی مختلف ہے۔ مولانا اپنے سے باہر جھانکتے نہیں اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ مولانا کے لئے تخلیق صفت عیش ہے اور شاہ جی کے لئے جاں کنی،

ما قصہ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم

از مابجز حکایت مہرو وفا میرس

عمر بھر ایک ہی تصویر کھنچوائی ہے۔ دوچار تصویریں اور بھی ہیں لیکن سب چوری چھپے کی۔ جب ان سے یہ کہیں کہ فلاں فلاں بزرگ کی تصویر بن چکی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد (جن سے شاہ جی کو خصوصی ارادت ہے) کی تصویریں عام ہیں تو وہ مسکرا دیں گے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میں سیاست میں ان کا مقلد ہوں شریعت میں نہیں۔ میرے لئے ان کا کوئی فعل حجت نہیں، بابو! میرے میاں شیخ علیہ السلام نے منع فرمایا ہے ان کے قول کے بعد سب ہموال

پیچ ہیں" (۴)

اسی زمانہ میں ملک فیروز خان نون نے دہلی میں کہا تھا کہ
 ”پاکستان نہ بنا تو ہم چنگیز خان و ہلاکو خان بن جائیں گے“
 شاہ جی نے وہیں ایک بڑے جلسے میں سنت نکتہ جیسی کی اور فرمایا
 ”فیروز خان کو شاید اپنے نام کی مناسبت سے چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مسلمان ہونے کا
 گمان ہوا ہے“

اگلے روز شاہ جی مولانا سے ملے تو مولانا نے ایک موضوع اٹھا کر کئی موضوع پیدا کئے۔

دعا دے مجھے اے زمین سنی
 کہ میں نے تجھے آسمان سے دیا
 مولانا گفتگو کرتے تو الفاظِ سلک مروارید ہوتے یار نگارنگ پھولوں کا سبدہ اور تمام اجزاء طبعی لئے کی طرح
 ہوتے۔ (۵)

شاہ جی نے فرمایا ”مولانا مسلمانوں کے عہدِ گم گشتہ کی ذہانت و فراست کا مجسمہ اور دہلی و بغداد کے
 علم و نظر کا مرقع ہیں۔ وہ آیتِ ربانی ہیں۔ فی الجملہ وہ مسلمانوں کے گمشدہ اقبال کی ترت پُرت
 تصویر ہیں۔“ (۶)

لاہور میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ایک معتقد کارخانہ دار تھے۔ (حاجی دین محمد صاحب مرحوم) انہیں لوہے
 کی ضرورت تھی اور لوہا ان دنوں مرکزی حکومت کے پرمٹ سے ملتا تھا۔ وہ شاہ جی کو اٹھا کر اور شاہ جی راقم کو
 لیکر دہلی گئے۔ وہاں بن بلائے مولانا نے ملنے سے انکار کر دیا۔ شاہ جی کو اپنے تعلق خاطر پر اعتماد تھا۔ اصرار کیا۔
 مولانا انکار کر چکے تھے۔ شاہ جی نہ ملے تو مولانا اندر سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اُن کا چہرہ غصے سے
 رہا تھا۔ شاہ جی کی بات سنی تو آگ بگولہ ہو گئے۔ فرمایا۔

”۱۹۳۷ء سے مسلمان صوبوں کی کانگریسی وزارتوں اور ہندو صوبوں کے مسلمان وزیروں کا
 انچارج ہوں۔ ان کا محاسبہ ضرور کیا ہے لیکن ان سے سفارش کبھی نہیں کی۔ آپ نے میرے
 بارے میں غلط اندازہ کیا ہے اور اس کے بعد جھٹ سے اندر لوٹ گئے۔“

شاہ جی کے ساتھ مولانا کا سلوک فی الواقع غلط تھا، مولانا اگر بے نیاز تھے تو شاہ جی بھی غیرت مند تھے۔
 مولانا کے متعلق انہیں اپنے ذہنی اعتماد کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ بہر کیف مولانا آزاد اس قسم کی سفارشوں کے
 معاملے میں آخری عمر تک بے لحاظ تھے۔ (۷)

کریس مشن کی آمد کے دنوں میں شیخ حسام الدین شاہ جی کی ملاقات کے لئے مولانا سے وقت لے
 آئے، اڑھائی بجے۔ پھر سے سارے چھ بجے شام تک کا اور یہ شاہ جی سے ہم سنی کے لئے کافی تھا لیکن شاہ جی
 گھر ہی سے چالیس منٹ لیٹ چلے، گھنٹہ بھر تاخیر سے پہنچے، مولانا کو ٹمپی کے دروازے پر پریشان کھڑے تھے،

موثران کا بگڑا ہوا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہا:

"ہاں تو ذرا آپ کا موثر مجھے چھوڑ آئے اور آپ یہاں میری واپسی تک بیٹھیں۔"

شاہ جی نے آگے بڑھ کر کندھا جھکاتے ہوئے کہا۔

حضرت، شانے حاضر ہیں،

"ہاں میرے بھائی! وہ بوجھ تو آپ اٹھائے ہوئے ہیں۔ (مولانا نے مسکراتے ہوئے کہا)

تھوڑی سی دیر میں واپس آگئے۔

فرمایا:۔ وائرس لگ لگ گیا تھا کہ پس سے کہا ہے جو فیصلہ بھی کرنا ہے جلد کیجئے یہاں دہلی میں گرمی کا زور ہو گیا ہے، چنانچہ گفتگو شمد منسل ہو گئی ہے۔"

شاہ جی نے پوچھا، حضرت! "غبار خاطر" چھپ گئی ہے؟

فرمایا:۔ "ہاں میرے بھائی، لیکن جلد سازی مکمل نہیں ہوئی، کچھ کاپیاں ناشر نے بھجوائی ہیں، ان میں سے ایک جواہر لال کو بھجوا دی ہے۔"

عبداللہ کو آواز دی، غبار خاطر کی دو کاپیاں لے آؤ،

ایک کاپی شاہ جی کو دستخط کر کے دی، (اس پر مولانا نے لکھا برائے صدیق عزیز مسد عطاء انٹر شاہ بخاری۔ ابوالکلام) دوسری مجھے، اس پر لکھا:

"پیاں خاطر عزیز بنی عبدالکریم شورش۔"

یہ میرے لئے ایک بڑا افتخار تھا، شیخ حام الدین پریشان سے ہوئے، مولانا ٹاٹ گئے، ایک کاپی اور سنگوا کے ان کی نذر کی، ہمارے ساتھ نوا بڑا نہ نصر اللہ خاں بھی تھے، انہیں آٹو گراف دیا،

ہے آج جو سرگذشت اپنی

کل اس کی کہانیاں بنیں گی

اب جو ملک کے مختلف مسائل پر باتیں چھڑیں تو گلفشانی گفتار کا نقشہ کھینچ گیا، طبع رواں کا دریا موجیں

مار رہا تھا، فرمایا:

"ملک میں غیر ملکی استبداد کا رہنا ممکن نہیں رہا، حکومت کے لئے ایک ہی چارہ کار ہے کہ ہندوستان کی حکومت ملکی نمائندوں کو سپرد کر کے چلی جائے، اب اگر حکومت نے یہاں رہنے پر اصرار کیا تو اس کے نتائج خطرناک ہونگے اس کی حکمرانی کے دن پورے ہو چکے ہیں اور کوئی ساداس بھی اسے پناہ دینے کے لئے باقی نہیں رہا۔ ساری روک اب اس بات کی ہے کہ جائیں تو کس طرح اور اختیارات منسل کریں تو کیسے اور کیونکر؟

"لیگ سے کیسے نمٹا جائے گا،" شیخ صاحب نے پوچھا،

"لیگ سے معاملہ تو بھر حال طے ہونا ہے، رہنا تو یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کو ہے، پاکستان

بنالیں تو بھی ہندوستان کے ان مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو یہاں رہیں گے اور جن کے لئے یہاں سے اٹھ کے جانا مشکل ہو گا نہ تو پاکستان جو بنے گا۔ اس کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو سمانا اور کھپانا ممکن ہے اور نہ عام لوگوں ہی کے بس میں ہے کہ پاکستان بنتے ہی ان کی آنکھ پاکستان میں کھلے گی، یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہی مشکل ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ کھٹن ہے، کھینے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ جناح کا نگرس سے غایت درجہ بدظن ہیں، ہر چند میں نے چاہا ان سے معلوم کروں کہ مصالحت ممکن ہو تو کس نقطہ پر ہو سکتی ہے یا وہ کس مقام پر ٹھہر سکتے ہیں لیکن ان کے جواب سے آپ لوگ آگاہ ہیں، گاندھی نے کئی دفعہ کوشش کی، جواہر لال بھی ہو آئے، لیکن وہ پٹھے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیتے، ظاہر ہے ہندوستان تقسیم ہوا تو پاکستان بھی تقسیم ہو گا۔ جوش و غضب میں ہوش و خرد کہاں رہتے ہیں، اب صورت حال یہ ہے کہ ہر فریق اس کوشش میں ہے کہ پاتا کیا ہے؟ جہاں تک اختیارات کی منتقلی کا تعلق ہے، انگریز چاہیں بھی تو روک نہیں سکتے، وہ ہندوستان کو واقعی چھوڑ رہے ہیں، کانگریس چاہتی ہے یہ کام اس کی خواہش کے مطابق ہو، اور مصالحت اس سے ہو، لیگ چاہتی ہے کہ اس کا موقف پورا ہو اور بھر قیمت پورا ہو، اختیارات تو کانگریس اور لیگ ہی کو منتقل ہونگے لیکن مفاہمت کے فقدان اور اس سے پیدا شدہ آویزش نے انتقال اختیارات کی نوعیت اور اس کا تعین حکومت کے ہاتھ میں دے دیا ہے، ظاہر ہے فریقین راضی نہ ہوں تو فیصلہ تیسری جماعت کو دینا پڑتا ہے۔"

شاہ جی نے کہا..... اس کا مطلب ہے کہ لیگ سے صلح کی ہر کوشش ناکام ہو گئی ہے۔ مولانا نے

فرمایا

"فی الحال تو ناکام ہی ہو گئی ہے۔ آئندہ کامیابی کا امکان نہیں، بلکہ حالات اور خراب ہو چکے ہیں۔"

شاہ جی نے چاہا۔ مولانا کی طبیعت کا رخ ادبیات کی طرف پھیر دیا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ٹکے ہوئے ہیں اور ان کی طبیعت پر کوئی بوجھ ہے۔ البتہ وہ چیزیں جو گھنٹہ بھر کی اس صحبت میں معلوم ہوئیں یہ تھیں کہ:

(۱) صورت حالات سے خوش نہ تھے، ہندوستان کی آزادی کا نقشہ جو کبھی ان کے ذہن میں تھا اور حورارہا جا رہا تھا، آزادی آرہی تھی مگر اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہ رہے تھے جو کچھ ان کا دل موس کرتا کھل کے

نہیں کھتے تھے، انسانوں میں رہ کر بھی آخر تک انہیں اپنی تنہائی کا احساس اور اس پر اصرار رہا۔

(۲) اس ملاقات سے بہت پہلے ہماری ان سے ملاقات ہوئی تو روزانہ شی کے پلان ان کے ذہن میں تھا، اور وہ چاہتے تھے مسلمان اس کو من و عن قبول کر لیں، اس سے بہتر نتائج پیدا ہونگے، مولانا کے الفاظ جو میری یادداشتوں میں درج ہیں، تقریباً یہ تھے کہ:

"جو حل میں نے تجویز کیا ہے اگر جانہیں نے اس کو مان لیا تو جس انتہا پر سیاسی پیمان ہے

یا جس سطح پر حالات کھول رہے ہیں اس حل سے وہ پہچان بھی ختم ہوگا اور حالات بھی معمول پر آجائیں گے۔ اس طرح غن و نعمین، شک و شبہ، اور تکرار و تضاد کا مطلع صاف ہو جائے گا۔“

”وزارتی مشن جو سکیم پیش کر رہا ہے آپ کی ہے؟ شیخ صاحب نے پوچھا،

”نہیں بھائی! سیاسیات میں کوئی خیال، تبویز، نقشہ یا موقف کسی فرد و احد کی ملکیت نہیں ہوتا، یہ چیزیں باہمی سوچ، بچار اور گفت و شنید سے وضع ہوتی ہیں، میں نے ایک خاکہ تبویز کیا تھا، میرا خیال ہے وزارتی مشن نے اس پر صاف کیا ہے، اب اس کی تفصیلات اور جزئیات کا انحصار ان کے اپنے فکر اور اپنی دسترس پر ہے کہ وہ اس کو کس طرح آخری شکل دیتے ہیں۔

مولانا قدرت کا عطیتے لیکن

مصنف درمیان زندیقان

پنڈت نہرو ان دنوں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن خبر لائے کہ وہ شاہ جی سے ملنا چاہتے تھے اور میں انہیں میر احمد حسن کی دکان پر کل پانچ بجے شام مدعو کر آیا ہوں۔ پنڈت جی وعدہ کے مطابق پہنچ گئے، شاہ جی سے معاف کیا ہم سے مصافحہ، میں تھا، شیخ صاحب تھے، ماسٹر تاج الدین انصاری تھے، مولانا حبیب الرحمن تھے اور میر احمد حسن، تعارف ہوا، پنڈت جی کوئی سہاگنٹھ ٹھہرے، کھل کے باتیں کیں، ہندی سنسکرت کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا، سیاسی بات جیت میں انگریزی ضرور ٹپک پڑتی ہے، مجال ہے کسی اصطلاح یا کسی خیال میں انگریزی کا لفظ آیا ہو، صاف ستھری بے عیب اردو بولتے رہے جیسے کوئی فیصلح لکھنؤی ہو، خودالہ آباد کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کی اپنی زبان اردو تھی۔ جو کس فقرے، روزمرہ کا غازہ، محاورے کی سرخی، سلاست کا زور، دانائی کا عمق، انشاء کی زیبائی، بول چال کی صفائی، غرض اردو ان کی زبان پر قربانت شوم کی صدا دے رہی تھی..... پنڈت جی سیاسی، معاشی اور مجلسی بحثوں پر گفتگو کرتے رہے، انہیں شدید احساس تھا کہ فرقہ وارانہ مسلہ حل نہیں ہو رہا، اور ہر گفتگو کے بعد مزید الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

”تقسیم ناگزیر ہو چکی ہے تو مان لیں:“ میں نے پنڈت جی سے کہا،

”بظاہر تو ناگزیر ہو چکی ہے لیکن ایک دوسرا حل بھی سامنے آگیا ہے، مولانا آزاد نے وزارتی مشن کو ایک خاکہ دیا ہے، شاید اس کے مطابق کوئی صورت نکل آئے، کہ پس نے تو مجھ سے یہی کہا کہ وزارتی پلان کے لئے مولانا کی تجاویز ایک عمدہ بنیاد ہیں۔“

”وہ خاکہ کیا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

پنڈت جی مسکرائے۔ ”ہفتہ عشرہ میں سامنے آجائے گا، کوئی چیز بجا۔ نہ خود راز نہیں ہوتی، صرف وقت کی اڑچن ہوتی ہے کہ اب بیان کی جائے یا وقت پر لور جو چیز راز ہوتی ہے اس کا عوام سے تعلق نہیں ہوتا۔“

شیخ صاحب کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا

”جناح کا ماننا اور ہمارا ماننا دونوں بیکار ہو چکے ہیں، اپنی سی سب کو ششیں کر لی ہیں۔“

ماؤنٹ بیٹن پلان کے بعد بھی پنڈت جی کا یہی خیال تھا کہ بٹوارہ نہیں ہوگا، کیونکہ تقسیم کا ماننا اور چیز سے اور تقسیم کا ہونا دوسری چیز، لیکن ملک تقسیم ہو گیا، پنڈت جی نے اس روز ایک عجیب سا ”انکشاف“ کیا کہ سکندر حیات نے قرار داد پاکستان کے فوراً بعد انہیں ایک خط لکھا تھا کہ وہ تقسیم کے حامی نہیں ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا آپ نے تو قرار داد لاہور کی تائید کی ہے؟

جواب دیا کہ ”اسٹیج کی بات اور ہوتی ہے۔“

شاہ جی نے کہا وہ خط کہاں ہے؟ پنڈت جی نے کہا الہ آباد میں کہیں پڑا ہوگا، آپ ذکر کرنا چاہیں تو میرا نام لے دیں، میں وہ خط آپ کو بھجوا دوں گا۔

پنجاب کا ذکر پھر کیا تو پنڈت جی جھنجھلا گئے۔

”پنجاب نے ہمیشہ ہی رو کاو میں پیدا کی ہیں۔!“

میں نے کہا۔ ”پنڈت جی آپ نے جو لیڈر صوبہ کے لئے منتخب کئے ہیں ان کی سزا عوام کو نہ دیں۔“

مسکراتے، ”نہیں صاحب، یہ بات نہیں اول تو ہم نے لیڈر منتخب نہیں کئے، لیڈر تو عوام منتخب کرتے ہیں، ہم نے تو انہیں کام سونپا ہے، لیکن پنجاب کا مزاج ہی ایسا ہے کہ جب تک آپس میں چغلی نہ کھائیں یا ایک دوسرے کو گرائیں نہیں، ان کی طبیعت ہی آسودہ نہیں ہوتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ پنجاب کے بیشتر کام رکے رہتے ہیں اور پنجاب کا مسئلہ ہم سب کے لئے دردِ سر بن گیا ہے، کوئی سا گوشہ اطمینان کا نہیں رہا۔“

”یہ پنجاب ہی تھا جہاں راوی کے کنارے آپ کی صدارت میں کامل آزادی کا ریزولوشن پاس ہوا اور

صدارت کا پہلا شرف آپ نے پنجاب ہی کو بخشا تھا۔“ میں نے کہا۔

”یوں تو پنجاب سے میرا تعلق بہت گہرا ہے، میری والدہ پنجاب کی تھیں۔ لاہور چو نے منڈی میں ان کا مکان تھا لیکن پنجاب کا سیاسی مزاج ہمیشہ قابو سے باہر رہا ہے، وہاں سیاسیات سے زیادہ ذاتیات کے جھگڑے رہتے ہیں، ہم نے بہت چاہا کہ احرار کانگریس میں شامل ہو جائیں، صوبہ کانگریس کو دو سال کے لئے معطل کر کے احرار کے حسبِ منشاء ایک کمیٹی بنا دینا چاہی جو صوبائی کانگریس کے ہر کام کی انجام دہی کرتی لیکن احرار ہی راضی نہ ہوئے۔“

پنڈت جی نے یہ بات کہہ کر شاہ جی کی طرف دیکھا شاہ جی طرح دے گئے،

پنڈت جی جانے لگے تو میں نے ان سے عجیب سا سوال کیا۔

”پنڈت جی، لوگ آپ سے محبت کیوں کرتے ہیں؟“

پنڈت جی مسکرائے..... بھئی یہ بھی کوئی سوال ہے؟

میں نے اصرار کیا تو شاہ جی نے کہا، "یہ لوگوں سے محبت کرتے ہیں اور لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔" (۸) پنڈت جی رک گئے۔

"جی نہیں! وجہ یہ ہے کہ لوگ آوارہ گرد ہوتے ہیں اور میں بھی آوارہ گرد ہوں، لہذا دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

مسلم لیگ نے مولانا کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا وہ گالی گشتار کی انتہاء پر تھا۔ نیاز مند ہدرت اس پر برہم تھے۔ ترجمان احرار روزنامہ آزاد (لاہور) بھی جواباً طعن و طنز کی زبان استعمال کرنے لگا مولانا کو پتہ چلا تو راقم کو بلا بھیجا احتقر دہلی پہنچا، فرمایا

"زندگی نہ بھرک اٹھنے کا نام ہے نہ بھج جانے کا
بلکہ سلگتے رہنا ہی زندگی کا نام ہے"

لیگ کی لپٹی زبان ہے اور وہ ہماری زبان نہ ہونی چاہیے۔
سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو راقم کی موجودگی میں کہا:

"شاہ جی خطابت آپ کو عطیہ الہی ہے۔ اور جو چیز عطیہ الہی ہو اس میں درشتی نہ ہونی چاہیے۔ جو لوگ حریف بذلہ نہیں ان کے ذکر سے اجتناب ہی بہتر ہے۔ آپ ماشاء اللہ خطابت کے سمندروں سے موتی نکال لاتے ہیں۔ آپ کو ان چھوٹی موٹی نندیوں سے کیا نسبت؟ جو صرف سنگریزے اگتی اور ریت پھینکتی ہیں۔" (۹)

خلافت کی تحریک ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی لیکن ۱۹۳۰ء کا زمانہ لنگے برگ و بار کا زمانہ تھا۔ جس طرح بہار کے موسم میں پھول آگ آتے اور چمنستان لالہ و گلاب سے لاپھند جاتے ہیں۔ اسی طرح اس زمانے میں سیاسی کارکنوں، سیاسی رہنماؤں اور سیاسی خطیبوں کی ایک بڑی جماعت پیدا ہو گئی۔ سارا ملک ان سے متحرک ہو گیا۔ کوئی سی ہندوستانی قوم اس سے خالی نہ رہی۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی، ہر جماعت میں شخصیتیں دھلنے لگیں۔ فی الجملہ یہی زمانہ اردو میں جاندار سیاسی خطابت کا عہد آغاز تھا۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، مولانا ظفر علی خان، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا احمد سعید دہلوی کے علاوہ خطیبوں کی ایک لہر ڈوری لگ گئی۔ احرار رہنماؤں کی پوری جماعت خطباء کی جماعت تھی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری آغاز میں صرف خطیب تھے۔ ان کی سیادت کا چراغ ان کی خطابت کے چراغ سے مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اردو زبان نے ان سے بڑا عوامی خطیب پیدا نہ کیا۔ ان میں ید اللہی یا نکلیں تھا کہ مجمع ہائے عوام کے خیر آن واحد میں سر کر لیتے تھے۔

مولانا آزاد میں محمد علی مبارزت، ظفر علی خان کی مقابست، عطاء اللہ شاہ کی شہادت اور احمد سعید دہلوی کی نزاکت کے عناصر نہ تھے۔ لیکن وہ ہر رعایت سے لے لے جامع الصفات خطیب تھے کہ خطابت ان کے بیان کا

ہاں تھی۔ اکثر خطباء وزعماء ان کے محاسنِ خطابت اور مجاہد نگارش سے فیضیاب ہونے کا اعتراف کرتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری قرنِ اول کے فقر و استغناء کی تصویر تھے۔ ہندوستانِ خطابت میں ان کا کافی نہیں رکھتا تھا۔ خود مولانا آزاد نے ان سے متعلق کہا تھا کہ:

"اس باب میں قومی جدوجہد کا ہر گوشہ ان کا شکر گزار ہے"

مولانا خیرت علی تھانوی فرماتے تھے کہ:

شاہ جی کی باتیں عطاء اللہی ہوتی ہیں۔"

ان کا حال یہ تھا کہ گاندھی و نہرو سے بھی انگو کے ساتھ ملتے لیکن مولانا آزاد سے اس طرح ملتے گویا ان کے جُود ہوتے اور ان کی بزرگی سے مرعوب ہیں۔ (۱۰)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے پاس مولانا کے کئی ایک خطوط تھے۔ شیخ حسام الدین کے پاس بھی چند مکتوب تھے۔ لیکن وہ تقسیم کے خرابہ میں ضائع ہو گئے۔ (۱۱)

مجلسِ احرارِ اسلام کے نوے فیصد زعماء مولانا آزاد اور الملّال کی دعوت پر جنگِ آزادی میں شریک ہوئے۔ (۱۲)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطابت کے ہادشاہ تھے۔ جس طرح الملّال کی صحافت میں قرآن کی آیتیں اور شاعری کے تیرو نشتر ہر پیرے یا فقرے کے موڑ پر ہوتے اسی طرح شاہ جی کی خطابت میں قرآن کا جلال اور شاعری کا جمال ہوتا۔ سامعین ان کے سر کا شمار ہوتے۔ شاہ جی الملّال کے ذہنی شاگرد تھے۔ الملّال کا جادو تھا کہ سارا ملک اسی کا ہو گیا۔ اس نے خطیبوں اور رہنماؤں کی ایک سیاسی جماعت پیدا کی جس نے استعمار دشمن ہندوستان طیار کیا۔ الملّال کے اس فیضان سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مجلسِ احرارِ اسلام کے ذہنی پس منظر میں اسلام کے شغف کی حد تک الملّال ہی کے دورِ اول کا ولولہ ہے۔ (۱۳)

علامہ انور شاہ کا شمیری سے متعلق مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (رئیس الاحرار) نے بتایا کہ مولانا آزاد دیوبند میں حضرت قاسم نانوتوی اور حضرت شیخ الہند کی قبروں کے پاس ٹہل رہے تھے۔ علامہ انور شاہ نے دور سے دیکھا تو فرمایا:

"وہ دیکھو علم ٹہل رہا ہے۔"

فرمایا:

"ابوالکلام نے الملّال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔"

احرارِ زعماء الملّال و زمیندار کی پکار پر ملک کی سیاسی جدوجہد میں شامل ہوئے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۵۳ء میں تحریکِ تحفظ ختم نبوت کے ایک جلعے میں مولانا ظفر علی خان کے دونوں گالوں پر عقیدت کے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا:

"ظفر علی خان! تیرے ستارے صبح نے میرے جگر میں آگ لگادی تھی۔"

لیکن مولانا آزاد سے شاہ جی کی ارادت کا یہ حال تھا کہ اپنی سیاسی زندگی کو ان کی تصنیف سمجھتے۔ فرماتے: "الہلال نے مجھے خطابت سکھائی، سیاست پڑھائی اور زبان و بیان کی ندرت بخشی ہے۔"
الہلال نہ ہوتا تو نہ جانے کب تک ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں غلہ رہتا۔"
چودھری افضل حق، احرار کا شاہ دستاویز تھا۔ شاہ جی انہیں مجلس احرار کا مہتمم سمجھتے۔ چودھری صاحب مولانا آزاد کو ملک علم کا شہنشاہ اور تدبر کے اعتبار سے بے پناہ سمجھتے تھے۔ فرماتے:

"ابوالکلام نے مجھے اس راہ پر ڈالا اور شاہ جی نے تائید ار کی وردی اتروادی۔"

مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے مولانا آزاد کو ہمیشہ اپنا مرشد کہا، فرماتے:

"ابوالکلام میں مدینہ کا عشق، فاروق کا دبدبہ، عثمان کی حیاء، علی کا استغنا، ابوذر کا فقر اور

احمد بن حنبل کی استقامت رچی ہوئی ہے، وہ ان خصوصیات کا مجسمہ ہیں۔"

شیخ حسام الدین، احرار کا بازو تھے۔ مولانا سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ ان کے خلاف اختلافی بول تک نہ سنتے۔ کسی زبان پر ایسا کلمہ ہوتا تو اس سے الجھ پڑتے۔ فرماتے:

"ہم لوگ انسانی وجود میں ابوالکلام کی تحریریں ہیں۔" (۱۴)

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مولانا آزاد سے متعلق موتی لال نہرو کے یہ الفاظ راقم سے بیان کئے کہ:

"مولانا کے عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی اور ہوا انہیں بلکہ علم، فکر، فہم اور تدبر میں۔" (۱۵)

ایک دفعہ راقم نے شاہ جی سے کہا:

"شاہ جی آپ نے زندگی میں کتنی دفعہ مولانا سے ملاقاتیں کی ہیں؟"

فرمایا:

"یاد تو نہیں لیکن بیسیوں دفعہ ان سے فیض حاصل کیا ہے ہم نشین رہا، ہم سفر رہا، (جیل میں لکھتے رہے) اور بار بار ملاقاتیں کی ہیں۔"

"ان ملاقاتوں کو خود لکھتے، نہیں تو کسی سے لکھوا دیجئے۔ اس طرح ایک عمدہ کتاب ہو جائیگی۔"

"بھائی میں قلم کا آدمی نہیں۔"

"میں حاضر ہوں آپ بولتے اور سناتے رہیئے میں لکھتا جاؤں گا۔"

"خامہ فرسائی بھی تو ایک روگ ہے، پھر یہ چیزیں سکون دل سے ہوتی ہیں۔ فرصت میں قلمبند کی جا سکتی یا کرائی جا سکتی ہیں۔ آج زمانہ وہ ہے کہ سکون و فرصت دو نوعتہ ہیں۔"

"اس طرح ان گفتگوؤں کے اُکارت ہو جانے کا احتمال ہے۔ ایسا شخص جو آپ کے نزدیک اسلامی معاشرے کے اس قطب الرجال میں سب سے بڑا عبقری ہے اس کی گفتگوئیں قلمبند کرنا آئندہ نسلوں کی ایک امانت انہیں سونپنا ہے۔"

”ہاں بجائی ٹھیک ہے، لیکن مولانا کی زبان کہاں سے لاؤں ہم لوگ مولانا کے انکار کے سوانح ہیں۔ شاہ جی ٹال گئے لیکن صبح وشام کی بچائی کے باعث مولانا کا ذکر چھڑا رہتا، کئی باتیں معلوم ہوتیں، مولانا کے عظیم فقرے شاہ جی کے نوک زبان تھے۔

شاہ جی نے فرمایا:

”آحرار کی بنیاد مولانا ہی کے مشورے پر رکھی گئی۔ لیکن ہم لاہور میں وہ ٹکلتے ہیں، ہم جلوت کے وہ خلوت کے، انہیں ملنا سرخ گندک ڈھونڈ لانے کے مصداق تھا، ہم ان سے دوستانہ بے تکلفی نہ رکھتے، ہمارے اور ان کے درمیان علم کا فاصلہ تو تھا ہی لیکن ان کا ادب و احترام بھی ایک طبعی فاصلہ تھا۔ ہمارے سامنے روزمرہ کے عوارض تھے۔ اور وہ ان کی طرف نگاہ ہی نہ کرتے تھے۔ تاہم یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آحرار الہلال کی بازگشت ہیں۔“

”مولانا مسلمانوں سے اس قدر مایوس کیوں ہیں؟“ راقم نے شاہ جی سے پوچھا۔

فرمایا:

وہ تو نہیں لیکن مسلمان ان سے مایوس ہیں۔ مولانا نہ ان کی سطح پر اترتے ہیں اور نہ ان کے دماغوں

کی پستیوں سے ہٹ سکتے ہیں۔ مسلمان شاعری کی پیدوار ہیں، وہ لیڈر شپ سے اپنی خواہشوں کا اتباع چاہتے اور خود لائحہ عمل تبویز کر کے اسے تختہ دار پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی مضبوطی کے بعد مسلمانوں کی لیڈر شپ سرکاری امراء کی تعویذ میں چلی گئی، اور وہ اجتماعی طور پر بڑے بڑے جاگیرداروں، زمینداروں، تعلقہ داروں اور تہداروں کی ملکیت ہو گئے، مسلمان زندہ ہوتے تو مولانا مایوس نہ ہوتے اور مولانا تعلقہ دار ہوتے تو مسلمان ان سے بد دل نہ ہوتے۔“

”مولانا کی عبقریت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟“

”مولانا چونکہ مسلمان ہیں اس لئے ہر جہتی اعتراف مفقود ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابوالکلام کانگریس کی سب سے بڑی خرافات کا نام ہے وہ کانگریس کو طوفانوں سے ٹکالتے اور مخالفین کے دلوں میں اتارتے ہیں۔“

شاہ جی نے سر د آہ بھرتے ہوئے کہا۔

”مسلمانوں نے انہیں گر بلا میں کھڑا کیا ہے ان کے لئے مسلمانوں کی اکثریت خرافات کا کنارہ ہے، آج مسلمان صرف مسلمان ہوتے اور انہیں اپنی تاریخ کا علم ہوتا تو ان کی عقیدت کا مرجع ہوتے، یہ کوئی معمولی چیز ہے کہ جس ہندوستان کو انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینا تھا اس ہندوستان کی آزادی کے لئے ابوالکلام انگریزوں سے گفتگو کر رہا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اردو کو اپنی

متاع سمجھتے ہیں اور مسلمان اردو پر سیاست پیچھے جاتے ہیں گو مجھے خدشہ ہے کہ مسلمانوں کی اس عصبیت کے باعث اردو نہ صرف ہندوستان میں زخم کھائے گی بلکہ ایک عظیم ابتلاء کا شکار ہوگی۔ لیکن مولانا دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمائندوں سے، کہ ان کی زبان ہی اس وقت دنیا کی سب سے بڑی زبان ہے، اردو میں مذاکرات کرتے اور اردو میں، ہیکلام ہوتے ہیں۔ افسوس نہ بابائے اردو اس پر فرخ کرتے اور نہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوتی ہے۔ یہ ایک جذباتی بات ہی سی لیکن جذباتی قوم جب سیاسی طور پر ناپینا ہو جائے تو وہ حسن پر قبح کو ترجیح دیتی اور زیاں پر سود کا گمان کرتی ہے۔ مسلمانوں کی سرگزشت انہی حادثوں سے آئی ہوئی ہے۔

شاہ جی نے کہا..... ابوالکلام:

۱۔ اس زمانے میں ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے عبرتی ہیں اور فی الواقعہ ابوالکلام ہیں۔

۲۔ ان کا وجود قدرت کا عطیہ اور ان کا داغ معززہ الہی ہے۔

۳۔ وہ مسلمانوں کی اس لیڈر شپ کے میر قافلہ ہیں۔ جو تحریک خلافت کے زمانے میں ابھری اور قربانی و استقامت کی مظہر ہو گئی اور اب بھی مسلمانوں کی ناقدری کے باوجود ہندوستان میں سرگرم جد ہے۔

۴۔ وہ قرن اول کے حجاز کی آواز ہیں جو صدیوں کی مسافت کے بعد ہندوستان پہنچ کر خود مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو گئی۔

۵۔ ان کے ذہنی کمالات صرف اس وجہ سے عوام میں نہیں آتے کہ مسلمان ہیں، مسلمان انہیں مانتے نہیں اور ہندوؤں کے لئے ایک مسلمان کی پوجا (ور شپ) کیونکر ممکن ہے؟

۶۔ وہ ہندوستان میں اسلام کی صدائے رستخیز تھے، لیکن برطانوی عہد میں مسلمانوں کو رزم کے حدی خوان کی نہیں بزم کے نغمہ خوان کی ضرورت رہی ہے اور وہ ہمیشہ گفتار کے غازی ہی کا اتباع کرتے ہیں۔

۷۔ مولانا نہ ہوتے تو ہم نہ ہوتے، ممکن تھا ہندوستان کوئی اور کروٹ لوٹا اور مسلمانوں کی سیاسی رفتار بیا بانوں کی سمت مڑ جاتی۔ (۱۶)

- | | |
|---|--|
| (۱) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری، صفحات ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳ | (۹) مولانا ابوالکلام آزاد، از شورش کاشمیری صفحہ ۸۹ |
| (۲) ایضاً صفحہ ۵۱ | (۱۰) ایضاً، صفحات ۲۳۳ تا ۲۳۵ |
| (۳) ایضاً صفحہ ۵۲ | (۱۱) ایضاً صفحہ ۳۶۵ |
| (۴) (سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص ۱۹-۱۶-۱۵) | (۱۲) ایضاً صفحہ ۳۰۵ |
| (۵) مولانا ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری، صفحہ ۵۹ | (۱۳) ایضاً صفحہ ۳۱۵ |
| (۶) ایضاً صفحہ ۷۰، ۶۹ | (۱۴) ایضاً صفحہ ۳۵۸، ۳۵۹ |
| (۷) ایضاً صفحہ ۸۲، ۸۳ | (۱۵) ایضاً صفحہ ۳۶۱ |
| (۸) بوئے گل نال دل، از شورش کاشمیری صفحہ ۳۰۲ تا ۳۰۸ | (۱۶) ایضاً صفحہ ۳۹۳ تا ۳۹۶ |